اس کے بعد ابھی پانچ چھ دن گزرے تھے کہ صبح دس بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ میں شفا کی آرزو کے ساتھ شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ میرا حال چال پوچھا۔ حوصلہ دیا اور ہمت بڑھائی۔

میں نے کہا...... ''ڈاکٹر صاحب آپ نے بہت کھچل کی۔ اتنی مصروفیت کے باوجود چلے آئے۔''

آہستہ سے بولے...... ''آپ کہہ کر تو آنا ہی پڑتا ہے۔ کیا کریں مجبوری ہے۔''

راشد لطیف ہسپتال کے بائیں ہاتھ فرٹیلٹی سنٹر ہے اور اس کے عقب میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ ہے۔ ابھی دو دن نہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی اہلیہ طلعت کو لے کر میری طبیعت کا پوچھنے آ گئے۔ اب تک ان کی مروت کا یہ عالم ہے کہ میں اگر کبھی ہسپتال جا پہنچوں تو وہ بہ نفسِ نفیس مجھ تک آ پہنچتے ہیں۔ کسی کے علاج کی سفارش کر دوں تو وہ بغیر خرچ لیے اس کا علاج بھی کر دیتے ہیں۔ اب بتائیے اس مادی عہد میں ایسی مروت کی کس کو فرصت یا ضرورت ہے۔

دراز قد، ذہین چہرہ، مضبوط کاٹھی، پُراعتماد رویہ اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر اپنے پروفیشن میں ہی بے مثال نہیں، ساتھ ساتھ بیمار لوگوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔

نمی، ثنیہ، علی، ہاروی

اب مجھے ٹھیک طور سے یاد نہیں آ رہا کہ نمی ہماری زندگی کا حصہ کیونکر بنی۔ ہر ادھوری انفرمیشن چونکہ مجھے یا تو خود کرنا پڑتی تھی یا خاں صاحب کے اِکا دُکا جملوں اور ریمارکس سے مل جاتی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ خاں صاحب کچھ پیرزادیوں کے ایک گروپ کا بڑا فعال حصہ بن چکے ہیں۔ یہ خواتین اللہ کی رحمتوں برکتوں سے کثیر رزق پر دسترس رکھتی تھیں۔ اُن کے شوہر اس قدر مصروف تھے کہ ان کے پاس خواتین کی مجلسی زندگی کے لیے قطعی وقت نہ تھا۔

ان چھ سات خواتین سے نمی نے خاں صاحب کو متعارف کرایا۔ جس طرح امیر لوگ قوالوں کو بلا کر یا موسیقار کو گھر مدعو کر کے اپنی محفل سجاتے تھے' اس طرح کبھی کبھار کسی ایسے مقرر کو بھی ذائقہ بدلنے کے لیے بلا لیا جاتا جو انہیں دین' روحانیت اور صوفی ازم کی باتوں سے محظوظ کرتے۔ ابھی ایسی محفلوں کا رواج عام نہ تھا۔ ابھی یہ وی آئی پی کی دل لگی تھی۔ پھر ہولے ہولے معمول کے مطابق یہ فیشن بھی اُوپر والے طبقے سے سرایت کرتا مڈل کلاس میں پہنچا اور غریب طبقہ تو پہلے ہی مزاروں' خانقاہوں' سجادہ نشینوں' ڈیروں پر حاضری دینے کے عادی تھے اور اُن کی اس عقیدت کو امراء جہالت سے تعبیر کرتے تھے۔

غالباً نمی اس گروہ میں خاں صاحب سے پہلے داخل ہوئی۔ وہ اُن دنوں باغِ جناح کے سامنے کسی بلڈنگ میں رہتی تھی۔ نسیم کے شوہر سعودیہ ایئرلائنز میں اپریٹر کے چیف تھے۔ اسی پوزیشن کے دھکّے سے نسیم بانو کا ہر دروازہ کھل جاتا تھا۔ نمی کے شوہر فضلی زیادہ وقت جدہ میں رہتے تھے جہاں وہ سعودیہ ایئرلائنز کے Marketing & Agreements کے ڈائریکٹر تھے اور وہاں بڑی تندہی اور توجہ سے کام کرنا پڑتا۔

ان دعوتوں کا معمول تھا کہ پُرتکلف کھانے کے بعد خاں صاحب اس اندر سبھا میں پیر بادشاہ بن کر بیٹھ جاتے۔

پہلے تھوڑا سا لیکچر خاں صاحب اپنی مرضی کے مطابق سامعین کی نذر کرتے' پھر سوال جواب شروع ہو جاتے۔ اس [illegible] چائے کا دور چلتا۔ دنیاداری کی باتیں ہوتیں۔ مزاح کی چاشنی چلتی۔ میں ان محفلوں میں کبھی شریک نہ ہوئی۔

ایک روز خاں صاحب میرے پاس یہ کہنے آئے ''کچھ وقت ہو تو میری بات سن لو۔''

میں کام کاج چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہوئی ''جی؟''

''بات یہ ہے کہ کل دوپہر کے کھانے پر کچھ مہمان خواتین آئیں گی۔ وہ بہت اعلیٰ کھانوں کی عادی [illegible] انہیں ڈیروں پر کھانے کا کوئی تجربہ نہیں۔ ہمارا داستان سرائے مان آدر میں تو ہم نہیں' صرف ہمارے کھانے بہت [illegible] ہیں۔''

''جی تو میں بازار سے قیمے کے نان' تکے منگوا لوں گی۔''

''ہاں بھائی ناں! ایسا ظلم نہ کرنا۔ وہ بازاری چیزیں نہیں کھاتیں۔ ان کے گلے خراب ہو جاتے ہیں۔ [illegible] فوڈ پوائزننگ ہو جاتی ہے۔''

''تو پھر تو..... جی..... مشکل ہے۔ میں تو سادہ سادہ کھانے جانتی ہوں۔''

''بس پلاؤ' آلو کا شوربہ' دال' کباب لیکن ایک شرط ہے۔''

''جی وہ کیا؟''

''تم کھانا خود پکاؤ گی..... جیونی بہن صرف پراٹھے بنائے گی۔''

جیونی بہن گو مجھ سے بہتر پکاتی تھی اور پکاتی ہے لیکن خاں صاحب کے فیصلے کے آگے میں نے ہتھیار [illegible] دیے۔

ان خواتین کا مجھ پر بن دیکھے ہی رعب پڑ گیا۔ کالا لمبا میز ڈرائنگ روم میں دروازہ کھلتے ہی لگایا گیا۔ [illegible] حسب توفیق برتن سجائے گئے۔ ان دنوں میرے پاس تاجدار اور رفیق ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مہمانوں کا دھیان [illegible] میں اندر نہیں گئی۔ سنا ہے عورتوں نے آلو گوشت کی بہت تعریف کی۔ باقی سب سے تو میرا تعارف نہ ہو سکا لیکن [illegible] آ گئی اور مجھ سے یوں ملی گویا برسوں کی سکھی سہیلی ہو۔

''باتو آپا! یہ آلو گوشت کیسے بنایا ہے۔ سب لٹو ہو گئی ہیں۔ ہم نے تو ایسا آلو گوشت نہ کبھی کھایا نہ پکایا۔''

میں نے شیخی میں آ کر ترکیب تفصیل سے بتائی اور تب سے اب تک اس زعم میں مبتلا ہوں کہ ہمارے گھر [illegible] آلو گوشت کا شوربہ پکتا ہے' وہ بالکل لاثانی ہے۔

نیٹی اس طرح خاں صاحب سے سرکتی سرکتی میری اور بچوں کی دوست بن گئی۔ اُس کے علاوہ نسرین آفتاب [illegible] میری واقف بن گئی۔ نسرین امیر خواتین کی طرح بے مصرف زندگی گزارتے گزارتے اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ اشیا [illegible] کو اطمینان یا سکون نہیں بخش سکتیں۔ وہ خوشی ضرور عطا کرتی ہیں لیکن یہ خوشی دیرپا نہیں ہوتی۔ جیسے کسی اجنبی [illegible] سفر و قیام۔ انسان چاہے لاکھ آرام سے عیش سے کسی جگہ قیام کرے لیکن اوّل و آخر گھر کی یاد ستانے لگتی ہے۔

نیٹی ہمارے اور بھی قریب آ گئی' جب فضلی نے اُسے ماڈل ٹاؤن میں گھر خرید دیا۔ علی اور ثنیہ بڑی کلاس [illegible]

...ئے تھے اور فضلی انہیں اُکھاڑ کر جدہ میں نئے سکولوں کے تجربے سے گزارنا نہ چاہتا تھا۔

اب ہمارے گھر میں ایک نیا رنگ اُبھرا۔ نوجوانوں میں دوستی ہوگئی اور اس میں وہ سارا جذبہ گوندھ دیا گیا جو ...ن بلوغت کے عہد کا طرۂ امتیاز ہے۔ چھیڑ ڈالتا ہوئی چھیڑ ڈال لی۔ لڑائی پر آمادہ ہوئے تو لڑائی کر لی لیکن رہے ہمیشہ ...تھے۔ اس دوستی میں بیڈمنٹن کورٹ نے بہت فائدہ پہنچایا۔

گھر کے سامنے عین کالے پھاٹک کے پیچھے دنگا فساد، مسابقت اور برتری جتانے کے لیے کورٹ بنایا گیا۔ اس ...میں وہاں کے ڈنڈے گاڑے گئے اور نٹ لگایا گیا۔ شٹل کاک اور خوبصورت ریکٹ بھی آئے۔ نہ جانے بچوں نے خود پیسے ...ئے یا پھر کسی نے ان کی بے بسی کو سہارا دیا۔ بہرکیف ہر شام کھیل جاری رہنے لگا۔ اثیر احمد طبعاً کھلاڑی تھا۔ وہ کوئی کھیل ...بھی کھیلے اُس میں سٹائل اور پختگی خداداد صلاحیت کے باعث جلد پیدا ہو جاتی ہے۔

شام کو نینی اپنے دونوں بچوں سمیت ہمارے گھر آ جاتی۔ بیڈمنٹن چلتی۔ خوب شور و غوغا مچتا۔ ایک مرتبہ انیق ...سے کھیلتے کھیلتے جھگڑ پڑے اور آگے بڑھ کر اثیر کا ریکٹ توڑ دیا۔ بعد میں بہت پچھتائے اور اثیر سے چھیڑ ڈال لی۔ ثنیہ ...اور صبا کمزور کھلاڑی تھیں لیکن اُن کی کھیل کو لڑکے سنبھال لیتے۔

اس ٹیم بازی کے بعد ہم ان سب کو پانی اور شربت پیش کر دیتے۔ وہ لوگ شاذ ہی ہمارے گھر کھانا کھاتے ...تھے۔ کھانے کے وقت سے پہلے ہی سب تتر بتر ہو جاتے۔

انیق کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں عام طور پر سسرال چلے جاتے۔ اثیر ان دنوں پرائیویٹ ایف اے کی تیاری ...رہا تھا۔ غزل کی چھوٹی بہن صبا نے اثیر کو سوشل سٹڈیز پڑھانے کا بیڑا اُٹھایا۔ اُوپر لائبریری میں بیٹھ کر یہ دونوں پڑھتے ...تھے۔ یہاں سے ایک اور اُلجھن پیدا ہوئی۔ ثنیہ اور صبا دونوں اثیر پر منتفت تھیں۔ نینی اور فضلی بھی اس بات کے خواہشمند ...تھے کہ ثنیہ کسی طرح ہمارے گھر کی بہو بنے لیکن اثیر اور صبا وعدے وعید تک پہنچ گئے اور ثنیہ والا معاملہ لٹکتا رہ گیا۔

لیکن بچوں کے معاملات کا ہم بڑوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نینی جب نہ تب۔ مزے دار کھانے پکا کر لاتی اور خاں ...صاحب جو نعمتوں کو دست بستہ قبول کرنے کے عادی تھے بڑے خضوع و خشوع اور رغبت سے انہیں کھاتے۔ نینی کی ...بیٹوں کے طفیل علی اور اثیر میں بڑی دوستی ہوگئی۔ جب بھی نینی کو جدہ کا سفر درپیش ہوتا وہ ثنیہ کو تو ساتھ لے جاتی لیکن علی ...ہمارے پاس رہ جاتا۔

اثیر اور علی دونوں شہاب بھائی والے کاسنی کمرے میں اکٹھے ایک رضائی میں سوتے، ایک تھالی سے کھاتے، ایک ...گلاس سے پیتے۔ اسی نینی کے طفیل اُس کے دونوں بھائی بھی ہمارے گھر کا حصہ بن گئے۔ نینی کے بھائی امجد اور نغمہ بڑے ...ہی محبت والے تھے۔ نغمہ کھانے پکانے کی ماہر تھی۔ یہ دونوں تب جدہ میں رہتے تھے۔ جب ہم دونوں پہلی بار عمرہ کرنے ...گئے تو جدہ میں ان ہی کے پاس ٹھہرے۔ نینی کے بڑے بھائی آفتاب امریکہ میں رہتے تھے۔ جب بھی لاہور آتے خاں ...صاحب سے ملنے ضرور آتے۔

نینی کا خاندان مڈل کلاس تھا۔ اُن میں مشرقی اقدار تھیں۔ ہائی سوسائٹی میں گھسنے کے لیے نینی کے پاس ...خوبصورتی اور فضلی کا پاسپورٹ تھا۔ وہ اس پاسپورٹ کو استعمال کر کے وی وی آئی پی تو ضرور بن گئی لیکن اُس میں ایک عجیب

قسم کی عاجزی اور انکساری تھی جس نے اُسے کبھی زمینی حقیقتوں سے جدا نہ کیا۔

جب کبھی بچوں کو چھٹیاں ہوتیں نینی ان کو تفریح کی غرض سے کہیں نہ کہیں لے جاتی۔ فضلی ٹکٹ اور
بندوبست کردیتے اور یہ تینوں ہنستے کھیلتے روانہ ہوجاتے۔

ایسے ہی ایک سفر کی داستان سنیئے۔

نینی دونوں بچوں سمیت ممبئی گئی اور وہاں تاج محل ہوٹل میں ٹھہری۔ اس ہوٹل سے کچھ ہی قریب اُن دنوں
کا ہارٹ بیٹ دھرمیندر رہتا تھا۔ وہ عام طور پر تاج محل میں جا کر اپنے پنکھوں (fans) کو درشن دیتا۔ اُن کے ساتھ
پیتا' کھاتا پیتا ہوتا۔ ان ہی جھروکے درشنوں کے دوران نینی اور اُس کے بچے دھرمیندر کے بہت قریب آگئے۔

ثنیہ فلور پر اُس کے ساتھ ناچنے لگی تو تمام تماشائی گھیرا ڈال کر اُن دونوں کا ناچ دیکھنے لگے۔ بڑی
اور ثنیہ میں خودستائی اور خوداعتمادی کا بیج بویا گیا۔ دھرمیندر نے اُنہیں اپنے گھر مدعو کیا اور اس گھریلو دعوت نے
دلوں میں اپنی بڑائی مستحکم کر دی۔ وہ اپنے آپ کو خاص اور special سمجھنے لگے۔

اور اسی خوداعتمادی کے ساتھ جب واپس لوٹے اور اترائے اترائے ہمیں ملنے آئے تو خاں صاحب
کیا کہ یہ سفر ان بچوں کے حق میں نہیں تھا۔ دونوں بچے اپنی پڑھائیوں سے غافل ہوچکے تھے اور اُنہیں ناچنے
بننے اور شوبزنس سے وابستہ ہونے کا شوق اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔

اگر پاکستانی معاشرہ اُس وقت الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی سے وہاں ہوتا جہاں وہ آج ہے تو
اس وقت بہت اے ون ماڈل' ایکٹر یا کپڑوں کے ڈیزائنر بن چکے ہوتے اور نام و اکرام پاتے۔ لیکن
اقدار سے جیسا کیسا بندھا تھا اور کوئی جنریشن رتی چھڑانے کے عمل میں تھی لیکن ماں باپ سے مکمل چھٹکارا
تھا۔

نو دس بجے کا وقت تھا۔ صبح صبح نینی اور ثنیہ گھبرائی ہوئی گھر آئیں۔ خاں صاحب دفتر جاچکے تھے۔
گھر شانت تھا۔ ثنیہ کی سانس برابر نہ تھی۔ حواس باختہ نینی اپنے آپ کو کنٹرول کرنے میں لگی تھی۔

''بانو آپا! علی بھاگ گیا ہے۔''

''ہیں؟'' میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

''اُس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے..... پیر آف مکھڈ کا بیٹا اُس کے ساتھ پڑھتا ہے۔ شاید..... مجھے
کہ وہ اُن کے گھر چھپا بیٹھا ہے۔''

''گھر پتہ ہے پیر آف مکھڈ کا؟''

''ہاں جی۔''

''اگر ہم میں سے کوئی گیا تو وہ کبھی نہیں آئے گا۔ آپ سے وہ محبت کرتا ہے۔ اشیر کے ساتھ کھیلتا رہے
گہری دوستی ہے۔ آپ دونوں چلیں تو شاید بات بن جائے۔''

لیجئے جناب میں ان پریشان حال ماں بیٹی کے ساتھ پیر آف مکھڈ کے محل نما گھر کے سامنے پہنچ گئی۔

پر خوبصورت پتھروں سے آرائشگی کی گئی تھی۔ گلبرگ کے مین بلیوارڈ پر اس بنگلے میں جب میں پہنچی تو میں بدحواس تھی۔ گیٹ کے پاس کار میں نینی اور ثنیہ اپنی جگہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اندر جا کر مجھے تھوڑی دیر انتظار کروانے کے بعد علی آ گیا۔ محبت تو اس گھرانے کا خمیر ہے۔ یہ لوگ محبت میں آ کر کچھ بھی کر گزرنے والے ہیں۔

مجھے دیکھ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ''آپ مجھے فون کر دیتیں بانو آپا آپ کیوں آئیں؟''

''کیوں نہ آتی؟ چلو گھر چلیں.....میری خاطر۔''

وہ چند لمحے متذبذب رہا..... ''علی چلو! ثنیہ کی خاطر.....'' میں نے علی کو بلیک میل کیا۔

''پہلے آپ وعدہ کریں کہ.....کوئی مجھے پاکستان میں پڑھنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ میں ایچی سن کالج نہیں جانا چاہتا۔ میں وہاں جواب دے آیا ہوں۔''

''چلو تو سہی۔ یہاں یہ باتیں تھوڑی طے ہو سکتی ہیں۔''

''آپ وعدہ کریں۔''

میں نے وعدے کا تاوان ادا کیا اور علی کو ساتھ لے کر آ گئی۔ اس کے بعد علی گھر پر رہنے لگا۔ کچھ عرصہ فضلی کو سمجھانے پر صرف ہوا کہ علی کو امریکہ بھیج کر اسے عالی شان تعلیم سے مزین کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کی تعلیم محض تضیع اوقات ہو گی۔

ابھی علی لاہور ہی میں تھا کہ ثنیہ بیگم کنیئرڈ کالج سے بی اے کر گئی۔ نینی کو اسے بیاہنے کی جلدی تھی۔ اچھے سے اچھے رشتے چلے آ رہے تھے۔ ثنیہ خوبصورت' باصلاحیت لڑکی تھی۔ اپنی ماں کی طرح گھریلو خانہ داری اور کھانے پکانے کا ہنر جانتی تھی۔ ایسی لڑکی کسی گھر کا جھومر بن سکتی تھی۔

نینی ہمیشہ کی طرح خاں صاحب سے مشورہ کرنے آئی..... ''شکیل مسعود کا رشتہ آیا ہے خاں صاحب..... مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی۔''

''بہتر تو یہی ہے کہ ثنیہ سے پوچھ لیں۔'' خاں صاحب بولے۔

''جی وہ حسن پرست ہے۔ بس کہتی ہے مرد کو خوبصورت ہونا چاہئے۔ لڑکا لمبا ہے قبول صورت ہے۔''

''او بابا خوبصورتی کو چاٹنا ہے۔ پتہ نہیں ان بچوں کو کیا ہو گیا۔ ظاہری چیزوں پر ان کی جان نکلتی ہے۔ اب اُسے ہم سکندر کہاں سے لا دیں۔''

نینی بددل ہو کر گھر چلی گئی۔ اُسے ہمارے گھر سے کوئی ترکیب استعمال نہ ملی اور اس طرح اُس نے یہاں سے مشورے لینے چھوڑ دیئے' لیکن ملنا جلنا جاری رکھا۔

ایک روز صبح کے وقت شکیل میرے پاس آیا۔ لمبا' قبول صورت انتہا کا بردبار' شریف۔ گودی میں ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

''جی آپ سے ایک مشورہ لینا تھا۔''

ایک اجنبی سے میں پہلی ملاقات میں مشورہ کیا دیتی؟

''جی فرمائیے.....میں حاضر ہوں۔''

بڑی دیر وہ گم سُم سا رہا۔ میں بھی پہلو بدلتی رہی۔

پھر وہ بڑی شائستگی سے بولا.....''آنٹی جی! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں شکیل مسعود ہوں.....ثنیہ کا رشتہ میرے لیے آیا ہے۔''

''تم نے اُسے دیکھا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی.....میں اپنے والدین کے ساتھ گیا تھا۔ لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

''میری والدہ کو اعتراض ہے کہ لڑکی ایکٹریس سی لگتی ہے۔ ایسی لڑکیاں گھربار کے قابل نہیں ہوتیں۔''

''اول تو ساری خوبصورت لڑکیاں ایکٹریس ہی لگا کرتی ہیں۔ دوسرے یقین جانو اتنی اچھی لڑکی تمھیں کبھی نہیں ملے گی.....خانہ داری' کھانا پکانا روایات کی پاسبانی اُس سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا.....میری مانو تو فوراً ہاں کردو۔''

پتہ نہیں میری وجہ سے یا ثنیہ کی وجہ سے بات پکی ہوگئی۔

اب نینی کی مصروفیات میں اضافہ ہوگیا۔

ثنیہ نے اپنے سسرال میں رہنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ گھرانہ شکیل کی والدہ کے گرد گھومتا تھا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت بھائی بہن اکٹھے رہتے تھے۔ بندھی میں طرحدار بہو کے لیے کھلنے کی گنجائش نہ تھی۔ ثنیہ نے کچھ دیر تو کوشش کی اور پھر شکیل کو لے کر اپنی والدہ کے گھر آ بسی۔

یہ عہد ہماری نظروں سے روپوش رہا۔ نینی گویا ہم سے کٹ گئی۔ علی امریکہ سدھارا۔ شکیل اور ثنیہ کو اللہ نے بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کردیا۔ ہمیں نینی کے گھر کی خبر اُڑتی اُڑتی ملتی تھی۔ ہم بھی دوستوں کے تعاقب میں اُن کی آزادی میں مخل ہونے والے لوگ نہ تھے۔ کبھی کبھار وہ ملنے آجاتی لیکن اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ کبھی دُکھ سکھ کرنے کی نوبت نہ آتی۔

ایک روز پتہ چلا کہ شکیل نے بڑا خوبصورت گھر خرید لیا ہے اور اپنے بیوی بچے لے کر وہاں شفٹ ہوگیا۔ نینی نے اپنی ذاتی کار لے دی ہے اور وہ بڑے ٹھسّے کی زندگی بسر کرتی ہے۔

کچھ عرصہ گزرا تھا کہ شکیل ہمارے گھر آیا۔ وہ بابر کی ہائی نون ٹیکسٹائل ملز میں جنرل منیجر کی پوسٹ جوائن کرنے کی سوچ رہا تھا۔ ان دنوں میرا بیٹا انیس اور ثوبیہ دوسری منزل پر رہتے تھے۔ شکیل اُن سے مل کر باہر والی سیڑھیوں سے جا رہا تھا۔ جب وہ مجھے سیڑھیوں پر ملا۔

''آپا جی! بابر ایک اچھا ایماندار جنرل منیجر تلاش کر رہا ہے۔ آپ اثیر سے کہیں یہاں جوائن کرلے۔ بہت زیادہ کا پیکیج ہے۔''

''تم کیوں نہیں چلے جاتے ہائی نون ٹیکسٹائل میں؟''

''میں ضرور چلا جاتا لیکن مجھے ''ڈان'' اخبار میں نوکری مل گئی ہے جو میرے مطلب کی ہے۔''

یوں شکیل ''ڈان'' اخبار میں چلا گیا اور راشیر نے بابر کی فیکٹری سنبھال لی۔

میرا خیال تھا کہ اب راوی چین ہی چین لکھتا رہے گا لیکن زندگی کچھ جنت کا چھوٹا سا نمونہ نہیں ہے۔ یہاں خوشی، سوگواری، برائی، گمراہی، موت اور پیدائش غرضیکہ ان گنت آزمائشوں کا گھر ہے۔ ہر لحظہ کسی نہ کسی امتحان کا سامنا رہتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح نینی خاں صاحب کے پاس پریشان حال بیٹھی تھی اور مسئلہ بیان کر رہی تھی۔ میں نے چلے جانا چاہا تو خاں صاحب نے آواز دے کر بلا لیا..... ''سنو! اس ثنیہ نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔''

''اب کیا ہوا؟''

نینی نے بتایا کہ ثنیہ اب شکیل کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور طلاق چاہتی ہے۔ کچھ دیر سے Separation چل رہی ہے۔ شکیل اوپر والی منزل پر رہتا ہے۔ ثنیہ نیچے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

''ثنیہ کو ہوش کرنے بچوں کے مستقبل سے نہ کھیلے۔''

''آپ چل کر سمجھائیں خاں صاحب! میری کب سنتی ہے؟''

''دیکھو ایسے کرو نینی! تم امجد اور نغمہ کو بلاؤ۔ ہم بھی آجائیں گے۔ پھر ثنیہ کو سمجھائیں گے۔''

صبح گیارہ بجے کے قریب ہم شکیل کے گھر پہنچے۔ نینی اور اس کے مشیر نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی فلم کا سیٹ لگا ہے۔ ثنیہ سب سے الگ تھلگ منہ تھتھائے گم سم نہایت پریشان لگ رہی تھی۔ شکیل کو اوپر والی منزل سے بلایا گیا۔ وہ بھی پریشان اپنی ذات سے نالاں ڈگمگاتا آیا۔

جیسے کسی بم کے پھٹنے سے پہلے فضا چارج ہوتی ہے ایسے ہی ماحول میں خطرہ تھا۔

مشکل سے ساری صورتِ حال سمجھائی گئی۔

میں نے ہمیشہ کی طرح آگے بڑھ کر ثنیہ کا ہاتھ تھاما اور کرختگی سے کہا..... ''پتہ ہے تم کس آگ سے کھیلنے جا رہی ہو؟ یہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ چلو پاؤں پڑ جاؤ معافی مانگو، چلو۔''

ثنیہ آگے کم چل رہی تھی اور پیچھے زیادہ ہلکورے لے رہی تھی۔ شکیل اسے دیکھ کر سرو قد کھڑا ہو گیا۔ اس کی خاندانی شرافت سر سے پاؤں تک جھلک رہی تھی۔ میں نے بدوبدی ثنیہ کو اس کے قدموں میں انڈیل دیا تھا۔ تب تو کیا مجھے اب تک علم نہیں ہو سکا کہ انسان اگر اندر سے نہ مانے تو زبانی کلامی اعتراف کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔

ہم یہ سمجھے کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور شکیل اور ثنیہ میں پکی دوستی ہو گئی۔ لیکن بعد ازاں پتہ لگا کہ شکیل نے چالیس لاکھ دے کر بچے اپنے پاس رکھ لیے اور ثنیہ کو طلاق دے دی۔

لیکن یہ بعد کی کہانی ہے..... اس کے درمیان علی کی داستان بھی سن لیجئے۔ وہ گیا تو پڑھنے تھا لیکن طبعاً پڑھائی کی طرف راغب نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے باروے نامی لڑکی سے مسجد میں جا کر نکاح پڑھوا لیا۔ ادھر لڑکی کا گھر ڈانواں ڈول تھا اور نینی پر یہ بجلی گری۔ بیچاری ڈھے گئی۔

علی اپنی پیاری سی دراز قد باروے کو لے کر لاہور آ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ان دونوں کو بڑی شفقت احساس

تحفظ اور Support کی ضرورت تھی۔ یہ محبت اشفاق صاحب نے کھلے دل سے عطا کی۔ دونوں بچے عموماً صبح کے وقت ہمارے پاس آ جاتے تھے۔ ہاروے ظہر کی نماز میرے ساتھ پڑھتی۔ اجنبی دیس میں، اجنبی علی کے ساتھ اجنبی کلچر میں جگہ بنانا آسان نہیں۔ اللہ اُس پر اور اُس کے بچوں پر ہمیشہ رحمت کا سایہ رکھے۔

شکیل مسعود ترقی کرتے کرتے ''ڈان'' اخبار میں جنرل منیجر کے عہدے پر پہنچا اور اب ''ڈان نیوز'' کرتا دھرتا ہے اور کراچی میں رہتا ہے۔ جب کبھی شکیل لاہور آتا ہے وہ بچوں کو ثنیہ کی طرف بھیج دیتا ہے۔ یہ وقت بچے ماں بیٹیوں پر قیامت کا گزرتا ہے۔ بچوں کی آمد ان کی روانگی کے خوف میں بھسم ہو جاتی ہے۔

جب سے یہ حالات ہوئے ثویلہ اور انیس نے نینی کا بہت ساتھ دیا۔ میری بہو ثویلہ کو Underdog سے ہے۔ وہ ٹوٹ کر ایسے لوگوں سے محبت کرتی ہے جن کو زندگی اور زندگی کے فیصلوں نے دغا دیا ہو..... گویا وہ سر دھڑ کی بازی کر اللہ کو قرضِ حسنہ دینے پر تل جاتی ہے۔

لیکن زندگی اونچ نیچ کا نام ہے..... جب سے خاں صاحب اس جہان سے سدھارے اُس سے کچھ دیر پہلے چھٹم چھٹا ہو گئی۔ اب شکیل سے رابطہ ضرور قائم ہے لیکن دوسری پارٹی سے ایسی صورت میں دوستی کی امید نہیں کیونکہ کوئی ایسے فریقین کا ساتھ نہیں بن سکتا جن میں اینٹ کتے کا بیر ہو۔

حالات اتنے مخدوش ہونے کے باوجود علی کے ساتھ رشتہ برقرار ہے۔ اُسے امریکہ میں انیق بھائی اور بھابی کا سہارا ہے۔ پاکستان آیا تو ہم سے مل کر گیا۔ ہم وہاں گئے تو ایک دن کے لیے اُس کے گھر رہے۔ اُن دونوں نے ہمیں پریت سے رکھا..... اب اتنے سال گزر جانے کے بعد یہ خط شکور عالم لائے ہیں۔ شکور عالم نیویارک میں ایک ٹریول ایجنسی چلاتے ہیں اور ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ علی کا خط انگریزی میں تھا۔ شکور عالم نے اس کا ترجمہ کر کے مجھے دیا ہے۔ نینی کا خاندان محبت کا اسیر ہے۔ خط ملاحظہ کیجیے:

پیاری بانو آنٹی!

یقین کریں، مجھے لگتا ہے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ان دو لفظوں ''بانو آنٹی'' نے میری زبان کو میرے دماغ کو وسعت اور دل کو محبت کی گرمی سے روشناس کیا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ دل کا تعلق، جسمانی قرب، قلم کی بہترین تحریر یا دورِ حاضر کی مؤثر ترین برقی ایجادات کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔

اپنے پیاروں کی یاد، خیالات کی جنت کا ایک خوبصورت پھول ہے۔ جتنا اس کی گہرائی میں اُتریں خوشبو اور سرور اُتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔

اس سے پہلے کہ ہمیں اپنے وجود کا اس کے تعلق کے حوالے سے ادراک ہو، یادوں کی یہ بہشت ایک حسین پھول میں ڈھل جاتی ہے۔

کل کی بات لگتی ہے کہ پچیس سال پہلے آپ نے مجھ جیسے از خود رفتہ بھٹکے ہوئے نوجوان کو ماں کی پُرسکون محبت سے روشناس کرایا۔ آپ کی محبت کسی بھی غرض و غایت یا میری استطاعت سے مبرا تھی۔ آپ کی کشادہ دلی اَبد تک

قیود سے آزاد تھی۔ نہ جانے مجھ ایسے کتنے ہی علی آپ کی چوکھٹ پر پہنچے اور آپ نے سب کو بلاتخصیص اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی وقت سے نوازا۔

لیکن آنٹی! آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کے عطا کیے ہوئے اُس وقت سے فی الحقیقت ہم سب نے سکونِ دل کی وہ دولت حاصل کی جس کی ہر ایک کو تلاش رہی ہے۔ ہم کہ خود اپنے ہی دشمن بن چکے تھے ہمارے لیے روح و قلب کی بے چینی کا مداوا اگر کہیں تھا تو صرف اور صرف C-121 ماڈل ٹاؤن میں تھا۔

آپ کی توجہ اور محبت نے اس احساس کو جنم دیا کہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود دنیا بھر میں ایک اور صرف ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم جیسے اپنی ذات کی کمینگیوں سے آلودہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو ایک ماں کی محبت بھری آغوش اور ایک باپ کی شفقت ہمہ وقت منتظر ہے۔ جہاں ہمارا دُکھ نہ صرف سنا جائے' کوئی تنقید نہ ہو بلکہ گا ہے گا ہے ہمارے درد کی آگ کو آپ اپنے آنسوؤں کی ٹھنڈ سے سرد کر دیں۔

ہماری بے سروپا اور بے تکی داستانوں کو پوری توجہ سے سنا اور سمجھا جائے۔ اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہم جیسے گم کردہ راہ لوگوں کے لیے آپ کا گھر زندگی کے لق و دق صحرا میں پُرسکون سائے اور ٹھنڈے پانیوں کا سرچشمہ ثابت ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے ذاتی طور پر جن انعامات سے نوازا گیا اُن میں انکل اشفاق کی شفقت کے علاوہ نانا' توکی بھائی' کیسی بھائی' سیری' جونی' بہن' ثویلہ' جانو بھائی' رفیق بھائی' غفار بھائی اور نثار بھائی کی لازوال محبت کی یاد میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ میں آپ کے گھر میں کس طرح آزادی سے گھوما کرتا تھا۔ اس سے بھی تعجب کی بات یہ کہ آپ مجھے اس کی بخوشی اجازت دے دیتے تھے۔ انکل اشفاق اور بانو آنٹی کے گھر میں مجھے اپنائیت کا جو احساس ہوا وہ میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ بن چکا ہے۔

اگر شعوری طور پر نہیں تو میرے لاشعور میں علم و دانش کا وہ خزانہ ہمہ وقت موجود ہے جو میں نے آپ کے ہاں چاروں طرف بکھری کتابوں اور اُن سے باہر انکل اشفاق' مفتی جی' جناب واصف علی واصف اور ان سب کے سرخیل مردِ ابریشم جناب قدرت اللہ شہاب کی پُرکیف گفتگو اور محبت سے اپنے اندر جذب کیا۔

اس عظیم سرمائے کی بدولت آج گیارہ سال گزرنے کے بعد میں اس قابل ہوں کہ اپنے اندر بھرے ہوئے دُنیاوی کچرے کے ڈھیروں کو نکال سکوں۔ بلاشبہ آپ کے گھر کا نام ''داستان سرائے'' کا سب سے خوش رنگ' خوبصورت اور خوشبودار پھول ہیں' وہ سب خوش نصیب لوگ جن کو آپ سے ماں کی آغوش اور محبت نصیب ہوئی۔ آج بھی آپ کی لازوال قربت کی مٹھاس اور خوشبو اپنے دلوں میں لیے پھرتے ہیں۔

اُس وقت میں نے متعدد ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی جو فی الحقیقت میرے لیے از حد مفید ثابت ہو سکتی تھیں نہ مجھے اس بات ہی کا ادراک تھا کہ جہاں میں زندگی کی وقتی اور ناپائیدار عیاشیوں میں مبتلا تھا۔ میرا دل ایک دوسرے ہی تجربے سے گزر رہا تھا۔ گویا اس دوران وہ اندر ہی اندر آبِ حیات کے لازوال چشمے سے سیراب ہو رہا تھا جو اُن تمام

عظیم ہستیوں کے فیض سے تھا' جو داستان سرائے سے منسلک تھیں۔

اس کے بعد میری روح ایک طویل عرصے تک نیم جان سی رہی' لیکن اُس گوشہ عافیت سے دُور ہو کر میری زندگی پھر ایک نئی راہ پر گامزن ہوگئی۔ خدا کا شکر کہ اس طویل عرصے اور دُوری کے باوجود آبِ حیات کا وہ چشمہ جو آپ کا عطا کردہ تھا' مکمل طور پر خشک نہیں ہوا تھا۔

دراصل اس کا ذریعہ تھا زاویہ' کھیل تماشہ' مردِ ابریشم' شہاب نامہ' لبیک' تلاش اور میری خوش بختی پیارے نوی بھائی سے مسلسل قرب اور رابطہ۔ اس فہرست میں اور کتنے ایسے نام بھی ہیں جن سے تعلق محض اس احساس کے ذریعے تھا کہ اُن سے گفتگو' تعلقات' اُن کی خاموشی میں بھی مجھے ماورائی کیفیت کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اُن کے ذریعے مجھے اُن راستوں کا ادراک ہوا جن پر چلنے کی مجھے خواہش تھی اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو گامزن بھی ہوسکوں۔

مجھے یقین ہے کہ وہ دُعائیں جو عرصہ پہلے مجھے داستان سرائے سے ملی تھیں میری محافظ بنی رہیں اور بالآخر مجھے اس آبِ حیات سے روشناس کر دیا۔

ان تمام عنایات کے لیے میرا دل کی گہرائیوں سے شکریہ اور پیغامِ محبت قبول کیجیے۔

اپنا دھیان رکھیے گا۔

علی

ڈیئر آنٹی بانو!

میں ہر وقت آپ کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں میرے لیے آپ نے کیا کچھ نہیں کیا۔ میری رہنمائی کی۔ دوپٹہ اوڑھے آپ کا دلنشین چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

میرے لیے ماڈل ٹاؤن میں جنت اور دوزخ دونوں ہی موجود تھے۔ جنت صرف وہاں تھی جہاں آپ اشفاق انکل میرے رہبر تھے۔

آپ سے جدا ہونے سے پہلے مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں تھا کہ علم و ادب کی دنیا خصوصاً پاکستان میں آپ کا کتنا بڑا مقام ہے۔

میں یہ سوچ کر حیران ہوتی ہوں کہ مجھ جیسی ناچیز اور بے علم ہستی کو آپ کیوں کر اپنے سایہ عافیت اور حفاظت میں رکھتی تھیں۔ اس کے لیے میرا دل ہمیشہ آپ کا احسان مند رہے گا۔ یہ آپ کے عطا کردہ پند و نصائح ہی تھے کہ آج میں ایک خوش نصیب بیوی اور ماں بن چکی ہوں۔

آپ نے مجھے سادگی کا درس دیا۔ آپ ہی کے طفیل میں اپنے شریکِ حیات کی حقیقی قربت سے فیضیاب ہوئی۔ یہ آپ ہی تھیں جنھوں نے مجھے محض ایک جمعدارنی سے وہ کچھ بنا دیا جو میں آج ہوں۔ یوں مجھے اپنے خاوند سے تعلقات مضبوط کرنے میں مدد ملی۔

عمیر نے پچھلے دنوں مجھے آپ کی کتاب ''مردِ ابریشم'' سے وہ اقتباس پڑھ کر سنائے جو دراصل میری ہی کہانی

تھی۔ آپ کے قلم نے اُسے جو ندرت عطا کی اُس کا احساس مجھ پر کپکپی طاری کر دیتا ہے۔

میں جتنے سال بھی پاکستان میں رہی، سوچتی ہوں کہ نہ میرا کوئی دوست تھا نہ ہمدرد۔ لوگوں میں صرف اس لیے قابلِ قبول تھی کہ میں علی کی بیوی تھی۔ یہ خیال میرے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ لیکن پھر آپ اور انکل اشفاق میرے والدین بن گئے۔ مجھ میں اعتماد پیدا کیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ آپ میرے خیر خواہ بنے اور یوں میرا سب کچھ بن گئے۔

میں زندگی بھر آپ دونوں کے لیے نہ تو اپنی محبت کا اظہار کر سکوں گی اور نہ آپ کے ان گنت احسانات کے بوجھ ہی سے نکل پاؤں گی۔

میں دل کی گہرائیوں سے آپ سے پیار کرتی ہوں۔

محبت کے ساتھ

باروی

یہ صفحات میں نے رہنمائی کے دو اصولوں کے پیش نظر تحریر کیے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ محبت دو طرح سے زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ محبت کرنے والا اگر دکھاوے کی محبت بھی کرتا ہو وہ اپنی شیخی، برتری اور انا کی خاطر بھی محبت کا ڈھونگ رچاتا ہو تو بھی اس محبت کا اجر اُسے زیادہ ملتا ہے اور یہ سودا بھی جس میں نیت کی خرابی ہوتی ہے نفع کا باعث بنتا ہے۔ کبھی واپسی میں گھاٹے کا امکان نہیں۔

دوسری محبت جو اللہ کی مہربانی سے بابا لوگ خاص کر اور کوئی خوش نصیب عام طور پر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایسی محبت کا اجر خود اُس انسان کی کیمیا گری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت میں محبت دینے کی بدولت ایک سدا بہار فرحت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پُر اُمید، زندگی پر بھروسہ کرنے والا، مشکلات سے نہ گھبرانے والی روح میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت، توانائی، تقویت اور استقامت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

ایسی دینے والی محبت عموماً ماں کے رُوپ میں دیکھنے کو ملتی ہے جو ایثار، قربانی اور خدمت کا مظہر ہوتی ہے۔ لیکن کسی پر احسان نہیں دھرتی۔ ایسی محبت کا رُوپ اُس باپ کی صورت میں بھی نظر آتا ہے جو ساری عمر جوتیاں چٹخاتا، محنتیں کرتا، بچوں کی خواہشات پر قربان ہوتا اور بیوی کی مشکلات کے آگے ڈھال بنا رہتا ہے۔

ایسا مرد بھی شجاعت، روحانیت اور استقامت کی تصویر بن جاتا ہے اور لوگ مدتوں اس مثالی رول ماڈل کو یاد رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کو اس کی مثال دے دے کر راستے کا تعین کرتے رہتے ہیں۔ محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جسے آپ آزما کر تو دیکھیں۔ آزمانا شرط ہے۔ میں نے تو منی اور اُس کے گھرانے کو یہ نسخہ برتتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے!

نور الحسن

جس شخص کا ٹیلی ویژن سے چھوٹا سا بھی رابطہ ہے، وہ نور الحسن کی شخصیت سے بخوبی نہیں تو سرسری طور پر ضرور واقف ہوگا، لیکن میں نے اس نوجوان کو ذرا مختلف انداز میں جانا ہے۔ خاں صاحب سے اُن کی زندگی میں ملتا رہا لیکن میں

نے اُسے نہیں دیکھا۔ جونہی خاں صاحب اپنے گھر سدھارے نورالحسن گریہ پائی سے داستان سرائے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے برآمدے میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے ساتھ ہی اس کمرے کی دیوار کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ دیوار نورالحسن کی ٹیک تھی۔ وہ پتہ نہیں کیسے اور کب آجاتا' اس دیوار سے لگ کر لڑکیوں کی طرح رویا کرتا۔ ویسے بھی نورالحسن میں کم عمر لڑکیوں جیسی لجاجت اور حیا ہے..... مجھے یہ تو کبھی توفیق نہ ہوئی کہ میں نورالحسن کے پاس بیٹھتی اور اُس سے رابطہ قائم کر لیتی..... لیکن اثیر احمد جو روز باپ کی قبر پر جاتے اور باپ کو بلاتے رہتے تھے' اُنھوں نے نور کو پہچان لیا۔ اُس دور میں جب باپ کو بھلانا مشکل تھا' نور اور عکسی نے اثیر کے دل لگانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ عکسی مفتی ہر ہفتے لاہور آتے اور اثیر کے ساتھ لگ کر اُس کا سر اپنے بازو پر رکھ کر سوتے..... نورالحسن نیچے قالین پر بیٹھ کر اثیر خاں کے پلنگ کے ساتھ جڑ کر اپنی پشت کو پلنگ سے ٹیک لگا کر بارہ بارہ بجے تک بغیر ہمدردی جتائے' دوستی کا دم بھرے بغیر ٹکے رہتے۔ ایسے مہربان زندگی کے زخموں پر پھاہا رکھنے کی بڑی اہلیت رکھتے ہیں۔

وہ گھر میں بڑی عاجزی اور انکساری سے داخل ہوتا اور ہاتھ جوڑے کندھے سکوڑے رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔ میں ابھی نور کی شناخت سے محروم تھی۔ پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ عموماً تبدیلیاں لانے والے چھوٹے چھوٹے واقعات ہی ہوا کرتے ہیں۔ پی ٹی وی نے اپنی چھیالیسویں سالگرہ کا فنکشن اسلام آباد میں منایا۔ مجھے خاں صاحب کا ایوارڈ لینے جانا تھا۔ فرخ بشیر نے میرے ساتھ میرے قیام و طعام کا بندوبست میریٹ میں کر رکھا تھا۔ چونکہ میں اُن دنوں بیمار تھی اس لیے میرے ساتھ اثیر بیٹے کی ٹکٹ اور رہنے کا انتظام بھی فرخ بشیر نے کیا۔

ہم دونوں ہوائی جہاز سے اسلام آباد پہنچے اور سیدھا عکسی مفتی کے گھر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی بہت ضروری میٹنگ کے سلسلے میں لاہور چلے گئے ہیں۔ ہماری دیکھ ریکھ کی ذمہ داری وہ بی بی اُنیب اور روبینہ کو سونپ گئے تھے لیکن اثیر نے واپس لاہور پہنچنے کو ترجیح دی اور مجھے بھی یہ مشورہ دیا کہ میں ہوٹل جا کر بسرام کروں اور ان دونوں خواتین کو بلاوجہ بور نہ کروں۔

اس تبدیلی کا پروگرام بتانے کے لیے اثیر خاں نے اپنے نورالحسن کو فون کیا کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل کے ڈیرے میں رہے۔ مجھے پروگرام کے وقت conduct کرے اور سارا وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہے۔ اثیر نے مجھے ہوٹل میں چھوڑا اور خود ایئر پورٹ سدھارا۔ اب میں ایک اغوا شدہ بچے کی طرح نورالحسن کی تحویل میں تھی۔

ہوٹل میں پہنچ کر نور نے مجھ سے کہا "اگر آپ چاہیں تو میں روبینہ یا پھر اُنیب کو آپ کے پاس چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے بھی پی ٹی وی والوں نے مدعو کر رکھا ہے۔ میں آپ کے آس پاس ہی منڈلاؤں گا۔"

میں نے کچھ لمحے سوچ میں گزارے۔ اُنیب بیگم عکسی مفتی کی ماتحت ہیں اور لوک ورثہ میں "دبستانِ شبیہ" کی ساری تزئین و آرائش کی انچارج ہیں۔ دو ایک بار وہ عکسی کے ساتھ ہمارے ہاں ٹھہر چکی تھی لیکن میں نے اُسے اس بیکار ڈیوٹی پر بلانا مناسب نہ سمجھا۔

روبینہ خالد مشہور و معروف رؤف خالد کی اہلیہ ہیں' لیکن اس کے علاوہ اُس کی سب سے بڑی خوبی اس کی فراخدلی اور سخاوت ہے۔ وہ اپنی ذاتی دولت کو اس خندہ پیشانی سے دوسروں پر لٹاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے..... میں نے سوچا وہ میرے پاس تحفوں سے لدی پھندی آئے گی اور میں اُس کی عنایات کا سوائے زبانی شکریہ کرنے کے اور کچھ نہ کر سکوں گی اس لیے میں

نے نور سے کہا.... ''بھائی! تم اُن دونوں کو رہنے دو۔ ہم دونوں ایک رات ایک دوسرے کی کمپنی کو زہر مار کرلیں گے۔''

نور اپنی عاجزی اور انکساری کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جھٹ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا.... ''ماں جی! میرے لیے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس کے متعلق میرے بچے بھی بڑے ہو کر شیخی مارا کریں گے لیکن مجھے معلوم ہے آپ کبھی کسی اجنبی کے ساتھ یوں رہی نہیں۔ کہیں آپ کے لیے مشکل نہ ہو

اب میں نے جھوٹ بولا.... ''ناں بھئی نور! تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو..... اثیر کا کوئی دوست میرے لیے کیسے اجنبی ہو سکتا ہے؟''

نورالحسن' اُس کی بیوی صائمہ' بیٹے اویس اور خالد ہمارے ہاں آتے جاتے تھے۔ صائمہ نے اثیر احمد کو اپنا بھائی بنا رکھا تھا۔ جب بھی وہ آتی عموماً دوسری منزل پر یہ دونوں چلے جاتے۔ اثیر بچوں کو پا کر نہال ہو جاتا۔ اُن کے ساتھ کھیلتا۔ انہیں ٹافیاں لیمن ڈراپ دیتا۔ نور تو میرے قریب اس قدر نہ آ سکا لیکن صائمہ واقعی بیٹی بن گئی..... لیکن پی ٹی وی کے فنکشن کے بعد نور بھی گھر کا فرد بن گیا۔

فنکشن ہوٹل کے ہال میں تھا۔ بالکل سامنے مغرب کی طرف پشت کیے سٹیج تھا۔ اس پر فرخ بشیر اور جج صاحبان رونق افروز تھے۔ دائیں بائیں سیڑھیاں تھیں جن پر سے انعام لینے والوں کو اُوپر جانا تھا۔ سٹیج کے دائیں جانب اُن لوگوں کے ڈیسک لگے تھے جن کو انعام حاصل کرنا تھا اور سامنے قطار در قطار ملک کے وی آئی پی' پریس کے نمائندے' صحافی دنیا کے جغادری' مقبول اور معروف ایکٹر پروڈیوسر' ڈائریکٹرز بیٹھے تھے۔ پھر اسلام آباد کے لوگ جو فنکشن شروع ہونے کے بعد تک آتے رہے۔

نور مجھے ہوٹل کے کمرے سے نیچے لایا۔ اُس نے مجھے صاحب لوگوں کی طرح بازو کا سہارا پیش کر رکھا تھا۔ میں اُس کا بازو اور ہاتھ تھامے اپنی سیٹ پر بیٹھی تو وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب میں خاں صاحب کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ لینے گئی تو وہ مجھے سہارا دیے سٹیج تک لے گیا۔

فنکشن بہت لیٹ ہو گیا۔

جب فنکشن ختم ہوا تو ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے۔ پتہ چلا کہ جو کوپن ہمیں دیے گئے تھے وہ تو نو بجے تک Valid تھے۔ اس کے بعد ہوٹل ہمارے طعام کا ذمہ دار نہ تھا۔ میں تو شاید مارے شرم کے بھوکی سو جاتی۔ یہاں پھر نورالحسن نے کاؤنٹر پر جا کر کھانا آرڈر کیا اور اُس کا بل بھی خود ہی چکایا۔

مجھے فکر تھی کہ میں شوگر کی وجہ سے بار بار غسلخانے جاتی ہوں نور تو میری وجہ سے بار بار جاگے گا' لیکن اُس رات مجھے پتہ چلا کہ نورالحسن تو بچوں کی طرح سوتا ہے۔ کوئی کھڑکا دھڑکا اُسے نہیں جگاتا۔ فجر کی اذان ہوٹل کے بالکل قریب ہی کسی مسجد سے آئی تو میں نے خدا کا شکر کرنے کی غرض سے کمرے میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ کئی بار کھانسی' پانی کے استعمال کے بعد میرا معمول ہے کہ بہت ساری چھینکیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ نور گھوڑے بیچ کر سویا رہا۔

پھر دن چڑھے ہمیں پی ٹی وی کی وین ایئرپورٹ چھوڑ گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اتنی ساری سیڑھیاں کیونکر چڑھوں گی۔ اس وقت بھی نور ہی آڑے آیا اور قریباً اُٹھا کر اُوپر اکونومی کلاس میں لا بٹھایا۔ مجھے کھڑکی والی نشست پر بٹھایا

اور خود درمیان والی سیٹ پر سکڑ کر بیٹھا۔ گھر آ کر اُس نے ہمیشہ کی طرح گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر اجازت چاہی۔ اس کے بعد پھر اشیر کا حلقہ بگوش بن گیا۔

لیکن رات کے قیام اور ساتھ نے نور کو گھر کا ایک فرد بنا دیا..... اب وہ اور صائمہ باقی بچوں کی طرح میری توجہ کے مطلوب بن گئے ہیں۔ صائمہ اچھے اچھے کھانے پکا کر اشیر خاں کی بیٹی زینب (مونو) کے لیے کپڑے ڈیزائن کرتی اور دعوتوں پر باورچی خانے میں ہاتھ بٹاتی اور کام کرتی ہے۔ نور جتنی بار میں کمرے میں داخل ہونے کا اُسے چانس ملے کھڑا ہو جاتا اور اس وقت تک کھڑا رہتا ہے جب تک میں بیٹھ نہ جاؤں..... ڈیرون پر ایسے لوگ ملا کرتے تھے جن کے ادب آداب کا یہی طریق کار تھا' لیکن ہمارے شرفاء میں یہ مبالغہ آمیز اُٹھک بیٹھک خوشامد پر محمول کی جاتی ہے۔

میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ محبت کے اظہار میں اپنی جان کو تکلیف دینا کچھ آسان سا کام نہیں..... لیکن سوچتی ہوں کہ ماسٹر آف Ceremonies بننا بھی تو کوئی عام پروفیشن نہیں..... یہ بھی تو اپنے آپ کو کمتر بنا کر دوسرے انسان کی صلاحیتوں کو تاج پہنانے کا ہی کام ہے..... البتہ کچھ کمپیئر ایسے منہ زور بے اور شہ زور بھی دیکھے ہیں جو مہمان کو کٹہرے میں کھڑا کر کے اُسے مجرم صورت بھی پیش کر دیتے ہیں۔

(نور الحسن نے ٹیلی ویژن کے لیے ایک پروگرام کیا جس میں چار درویش محمد یحییٰ خان' عکسی مفتی اور میں ہوئے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا پیشِ خدمت ہے)

اشفاق صاحب بڑی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ اُن کی رنگا رنگ تخلیق کاری نے عجب گل کھلائے چھوٹے سے تھے تو انہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ اسے وہ خود ہی لکھتے' اس کی کاپیاں بناتے اور سکول کی جماعت دوستوں میں بانٹ دیتے۔

پاکستان پہنچ کر جب انہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ایم اے اُردو کے دوران ہی اُن کی پہلی کتاب محبت سو افسانے" آ گئی۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ روم چلے گئے۔ واپسی پر خاں صاحب نے جلد ہی تلقین شاہ لکھنا شروع جو پورے 39 سال آن ایئر گیا۔ لیکن اُن کی تخلیقی قوتیں تلقین شاہ کی سرحدوں کو پار کر گئیں۔ پہلے خاں صاحب نے ڈرامے لکھے' پھر جونہی ٹیلی ویژن 1965ء میں ہماری زندگی کا حصہ بنا' انہوں نے اس میڈیا کو اپنا لیا۔ اس کے علاوہ نے بڑی عمدہ کمپیئرنگ کی۔ ٹیلی ویژن کے افتتاحی پروگرام کی کمپیئرنگ کا سہرا اُن ہی کے سر ہے۔ اس کے ساتھ موسیقی سے گہری دلچسپی نے "نکھار" جیسے پروگرام دیے..... "زاویہ" سے تو آپ کی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاں صاحب کی ہر دل عزیزی مختلف طبقوں میں اتنی ہی رنگا رنگ ہے اُن کی شخصیت..... جو پڑھے لکھے افسانے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ چاہتے تھے کہ خاں صاحب صرف افسانے لکھیں وہ بھی "اُجلے پھول" اور "ایک محبت سو افسانے" جیسے۔ "صبحانے افسانے" سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

جنہیں تلقین شاہ سے عشق تھا وہ انہیں کسی اور رُوپ میں دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ البتہ "زاویہ" دُور دُور الیکٹرونک میڈیا ہونے کی وجہ سے اس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر چاہنے والا اپنی پسند

بوکر مصر تھا کہ صرف وہی ٹھیک ہے۔

لیکن آج تین سال گزر جانے کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ خاں صاحب سے اُن کے چاہنے والوں کی وابستگی کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ قارئین' ناظرین کی محبت ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی کے عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی' برائی' کمی بیشی' اونچ نیچ محبت کے سامنے بے معنی ہے۔ محبت کو غالباً اسی لیے خدا کا سب سے بڑا روپ کہا جاتا ہے۔ محبت کرنے والا محبوب کی خرابیاں نہیں دیکھ پاتا بلکہ اُن کو اپنی خرابیوں کی طرح قبول کر لیتا ہے۔

ڈیروں پر اسی محبت کا مظہر نظر آتا ہے اور خاں صاحب غالباً اسی محبت کی تلاش میں بابوں کے پاس آنے جانے لگے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر زیادہ مان ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں کیڑے نکال کر کسی اور کا قد چھوٹا کر کے' کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی کلا جگاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ اُن میں یقیناً انسان ہونے کے ناتے خوبی اور خرابی دونوں کے دریا ساتھ ساتھ بہتے ہوں گے۔ یقیناً اُن میں حب مال اور حب جاہ کی طلب ہوگی۔ لیکن وہ کسی صوفی کی طرح جہادِ نفس میں مبتلا رہتے تھے حصولِ نفس میں نہیں۔ اُن کی زندگی میں ضروریات کو کبھی چھل کر دہکانا ضروری نہیں۔ بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانا اہم تھا۔

لیکن لوگوں کی محبت کے کیا کہنے۔ آج بھی تین سال گزر جانے کے بعد بھی لوگ اُن کی بشریت پر دھیان نہیں دیتے بلکہ انہیں ایک بہت بڑا آدمی' برگزیدہ صوفی' ایک اصول ادیب سمجھتے ہیں۔ نکتہ چیں لوگ اور محبتی مہربان سب خاں صاحب کی بہتری چاہتے ہیں۔ صرف طریقہ واردات مختلف ہے۔ مہربان لوگوں کا رویہ ماں کی طرح ستر پوشی کا ہے۔ عیب ڈھونڈنے والے سچ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

پتہ نہیں خاں صاحب ان دونوں کا احسان کیسے اُتار پائیں گے۔ اتنے فاصلے کیسے طے کریں گے؟

مجیب الرحمٰن شامی + چودھری سردار محمد + حمید صاحب

ڈرائنگ روم کچھ کچھ زاویے کا رُوپ دھارنے کی کوشش میں تھا۔ کچھ لوگ خان صاحب سے ملنے وقتاً فوقتاً آنے لگے تھے۔ ان میں مجیب الرحمٰن شامی' چودھری سردار محمد اور حمید صاحب عموماً اکٹھے آتے۔ میں ان کی صورتوں سے بھی واقف نہ تھی' لیکن ان کے آنے پر خاں صاحب خاص طور پر اندر آ کر کہتے:

''قدسیہ گوبھی کے پکوڑے بنا دو..... لیکن کسی اور کو تکلیف نہ دینا۔ یہ تم ہی کو پکانے ہیں۔''

یہ بڑے پُرتکلف دن تھے..... امیری اور غریبی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اسراف سے پرہیز اور فراخدلی سے خرچ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو رہا تھا۔

کبھی کبھی میں درمیانی دروازے تک پہنچ کر سنتی تو اندر سے تعریف کے ڈونگرے برستے سنائی دیتے۔ ان میں سب سے اُونچی آواز شامی صاحب کی ہوتی۔ سردار صاحب پولی آواز میں ہاں سے ہاں ملا دیتے۔ کبھی کبھی ان کے جانے کے بعد خاں صاحب مجھ سے کہتے:

''قدسیہ! اگر کبھی تمہیں ان پر کچھ لکھنے کی حاجت پیش آئے تو اجتناب کرنا۔ یہ تم سے بڑے لکھاری اور بڑے انسان ہیں۔ میرا ان سے کتنا ہی سیاسی اختلاف کیوں نہ ہو میں ان کی بڑائی سے منکر نہیں ہوسکتا۔''

شاید اسی تنبیہ کی وجہ سے میں نے کبھی سردار صاحب کی کتابوں پر قلم نہیں اُٹھایا۔

مجیب الرحمٰن شامی

اب مجیب صاحب کا اپنا اخبار ہے۔ اُن کا بڑا نام ہے۔ جلد ہی آپ کو یہ اطلاع بھی ملے گی کہ ٹی وی پر ''پاکستان'' چینل کھل گیا ہے۔ اُن کا منجھلا بیٹا عمر شامی اخبار میں اُن کے ساتھ سب ایڈیٹر کے طور پر بڑی شہرت کما رہا ہے۔ بڑا بیٹا علی سافٹ ویئر کا اپنا کام کرتا ہے اور بیٹی کنیئرڈ کالج میں پڑھانے کے بعد یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ سب بچے اپنے مقام پر مضبوطی سے مجیب الرحمٰن شامی کا کام اور نام روشن کر رہے ہیں۔

چودھری سردار محمد

سردار صاحب کے بیٹے ہارون جو بینک آف پنجاب میں جنرل منیجر ہیں' انہیں بارہا فون کیا کہ سردار صاحب کوئی بایوڈیٹا اُن کا کوئی شناختی مضمون بھجوایئے لیکن اُن کی طرف سے چپ رہی۔ پھر میں نے لندن والا میں سید امجد حسین کو فون کیے کہ سردار صاحب کی بیٹی انجم جو اس وقت اسمبلی کی رُکن ہیں اور سید امجد حسین کی اہلیہ ہیں' میری رہنمائی کے لیے کچھ لکھ دیں۔ لیکن رفتار کو زمانہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں اس طرح مصروف ہیں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔

حمید صاحب

ان دونوں کے ہمراہ حمید صاحب تیسرے نمبر پر تھے۔ قد میں سب سے لمبے' گفتگو میں آخری نمبر پر ہونے والے' تعریف کرنے میں صفر تھے۔ وہ کسی سافٹ ویئر کمپنی کو چلاتے تھے۔ مجھے خاں صاحب نے اُن کے متعلق کم کم ہی بتایا، اس لیے کچھ گوش گزار نہیں کرسکتی۔

مسعود میاں

قریباً 1985ء یا 1986ء کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا نما شخص مجھے ملنے آیا۔ میں نے اُسے بار بار پوچھا کہ کہیں خاں صاحب سے تو نہیں ملنا، لیکن اُس نے لجاجت سے کہا..... ''جی نہیں! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے۔''

اس مبارک شکل نوجوان سے میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے سوال کیا..... ''کوئی کام؟''

''جی نہیں کوئی کام نہیں۔''

عجیب سی بات ہے کہ آج 2008ء آ پہنچا' مسعود سے رابطہ قائم ہے لیکن اُس نے نہ کبھی کوئی فرمائش کی نہ کوئی چیز ہی مانگی..... یہ ضرور اضافہ ہوا کہ اب وہ السر کا مریض ہے۔ ڈپریشن اُس کا ساتھی بن گیا ہے اور اُس کی آنکھوں میں اعتماد اور خوشی کے بجائے اُداسی اور حیرانی کی سی کیفیت رہتی ہے جیسے وہ کسی سے پوچھنا چاہے کہ آخر میں نے کیا کیا ہے جس کی یہ سزا ہے۔ میرا قصور کیا ہے؟

آج کے عہد میں یہ سوال بیشتر نوجوان پوچھ رہے ہیں۔ مسئلہ سارا شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی میں مضمر ہے۔ اُنھیں دنیاوی ترقی اور کامیابی کا وہ مقام درکار ہے جس کو حاصل کرنے میں ایک عمر لگتی ہے۔ تیز رفتاری کے اس ...نے میں اتنا لمبا انتظار ذہنی طور پر تھکا دیتا ہے۔ کبھی وہ بابوں کے ڈیروں پر دنیاوی ترقی کا تعویذ لینے جاتے ہیں۔ کبھی ...بیر کے دروازے کھٹکھٹاتے اور بے نیل ومرام واپس لوٹ جاتے ہیں۔

مسعود اُس وقت Disillusioned نہیں تھا۔

میں نے اُس سے اُس کا حدود اربعہ پوچھا تو اُس نے لجاجت سے کہا.... ''والد صاحب نیشنل بینک میں چیف ...منیجر ہیں اور کچھ ٹھیکے پر زمینداری ہے۔ اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔''

میں نے کہا.... ''مسعود میاں! یہ کیا بات ہے کہ جو بھی بہاول نگر سے آتا ہے ہمیشہ اللہ کا شکر بجا لاتا ہے۔ کیا یہ ...یں کے بابوں کا اثر ہے۔ بہاء الدین ذکریاؒ وہاں کی مٹی میں قناعت کا بیج بو گئے ہیں کہ وہاں کے حاکم انصاف کو اس طرح ...نچے رہے ہیں کہ لوگوں میں شکایت کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟''

''یہ تو جی آپ کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ ہم تو فی الحال فکر و فاقے سے آزاد موج میلا منا رہے ہیں۔''

چند دن کے بعد مسعود پھر آ گیا۔ اس بار کھلا کہ اُس نے کہیں سے ''راجہ گدھ'' پڑھ لی تھی اور حسن اتفاق سے ...س کے سحر میں پھنس گیا۔ اسی روز اُس نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ سا پکڑا دیا۔ میں سمجھی کہ شاید کوئی فرمائش درج ہو گی۔ کھول ...کر پڑھا تو ایک نظم صاف ستھری لکھائی میں رقم تھی۔ بہت سال گزر جانے کے بعد ابھی تک مسعود کی لکھائی ویسی ہی صاف ...ستھری اور خوبصورت ہے۔ نظم کے شاعر کا نام معلوم نہیں بہر حال آپ نظم ملاحظہ کیجیے:

''اِک کمال کی خواہش''

کس طرح سجاتے ہو
مصلحت کی شاموں میں
محفلیں محبت کی، اور محبتیں بھی وہ
سال بھر مہک جن کی
دل کی ساری گلیوں میں رقص کرتی پھرتی ہیں
کس طرح جلاتے ہو
آندھیوں کے موسم میں تم دیئے رفاقت کے
تم جو جس موسم میں اِک ہوا کا جھونکا ہو
کچھ ہمیں بھی بتلاؤ، کچھ ہمیں بھی سکھلاؤ
ہم تمہارے جذبوں کے، نیک سی فضاؤں میں

پھول جیسے گیتوں کی رقص کرتی خوشبو کے
بے قرار شاعر ہیں

اس نظم کا مجھ پر بڑا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے فوراً عینک بدل لی اور مسعود کو بڑے شفیق شیشوں سے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا..... ''تمہاری تحریر سے لگتا ہے کہ تم لکھتے لکھاتے بھی ہو؟''

لڑکیوں کی طرح شرما کر وہ بولا..... ''جی کچھ سنجیدگی سے نہیں بس ایسے ہی شوقیہ۔''

کہنے کو تو مسعود نے کہہ دیا..... لیکن پتہ نہیں کیوں اس کے چہرے پر وہ آرزو جھلکنے لگی جو تخلیقی قوتوں کے فنکاروں میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد مسعود میاں میری زندگی سے غائب ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی زمینداری پر لوٹ گیا ہے اور مزے میں ہے۔ کافی دیر گزری کہ ایک روز مسعود میاں وارد ہو گئے۔

میں نے تکلفاً اس تاخیر کی وجہ پوچھی۔ مسعود نے بڑی ناامیدی سے کہا ''باتو آپا! والد صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد زمینوں کی ٹھیکیداری کے علاوہ Nesstle والوں کے ساتھ کنٹریکٹ کر لیا ہے دودھ کی سپلائی کا۔ ہم مختلف جگہ سے دودھ اکٹھا کر کے Nesstle کمپنی کو سپلائی کرتے ہیں۔''

میں نے کہا..... ''یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس میں اتنا مایوس ہونے کی کیا بات ہے؟''

مسعود کہنے لگا..... ''باتو آپا! مجھے خدشہ ہے کہ یہ کمپنی ہمارے لیے کہیں خدانخواستہ ایسٹ انڈیا کمپنی نہ بن جائے کیونکہ والد صاحب نے ساری زندگی ملازمت میں گزار دی۔ ملازمت پیشہ لوگوں کو عموماً کسی بھی طرح کے کاروبار کی پہچان نہیں ہوتی۔ آپا جی! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بے شمار لوگوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی جمع پونجی تاج کمپنی میں لگائی تھی یہ سوچ کر کہ مقدس کلام چھاپنے والی کمپنی ہے۔ یہاں اُن کا سرمایہ بڑا محفوظ رہے گا لیکن اُن کے ساتھ کیا ہوا؟ بیچارے دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو تاج کمپنی تھی ہم نے تو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ کنٹریکٹ کیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔''

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا..... ''دیکھو مسعود! مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔ اللہ سب خیر کرے گا میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور یاد رکھو ہر ناکامی سے کسی نہ کسی کامیابی کا پہلو ضرور نکلتا ہے اور ہر کامیابی کے ساتھ کوئی نہ کوئی ناکامی لگی ہوتی ہے۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں پریشان نہیں ہونا، گھبرانا نہیں۔''

ایک مدت مسعود مجھے ملنے نہ آیا۔

پھر ایک روز اُس نے تجربے کے پانیوں سے سر نکالا اور مجھے آ کر بتایا..... ''آپا جی! ایسٹ انڈیا کمپنی نے یک طرفہ طور پر کنٹریکٹ منسوخ کر دیا۔ ہم نے جو سرمایہ اس کاروبار میں لگایا تھا اُسے واپس نہیں نکال سکے۔ والد صاحب صورتِ حال سے بالکل مایوس نہیں ہیں۔ بقول ترقی پسندوں کا تصوف یا روحانیت صرف ایک نشہ ہے۔ ابو جی کے بعد اس نشے میں اور بھی زیادہ راسخ ہو چکے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں بہادر شاہ ظفر کی طرح لگ

آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

میں نے دلاسہ دینے کے انداز میں کہا..... "چلو مسعود! جسے تم نقصان سمجھ رہے ہو وہ بھی ایک طرح کا نفع ہے۔ تیرے بڑے ادیب کو ناکامی کا تجربہ کندن بنا دیتا ہے۔ تم لکھاری ہو اب تیزی سے منزل کی طرف بڑھو گے۔ اب تم بڑی سنجیدگی سے پڑھنے لکھنے کی طرف مائل ہو جاؤ گے۔"

شاید میری تھپکی کا اثر تھا کہ اُس کے اندر کا ادیب جاگ گیا تھا۔ وہ لکھنے لکھانے کی طرف سنجیدگی سے مائل ہو گیا تھا۔ مسعود نے مجھے کبھی نہ تو کتاب چھپوانے کے لیے کہا نہ کسی افسانے کو لکھنے کے لیے مجھے اس پر تبصرہ کرنے کے لیے مجبور کیا۔ پھر اُس کی کہانیاں چھپنے لگیں۔ اُس کی جھولی میں کچے بیروں کی طرح خود بخود تعریف کرنے والے fan گرنے لگے۔ نوے کی دہائی میں کہیں مسعود ہمارے ساتھ منسلک ہو گیا۔ خاں صاحب کا تلقین شاہ کتابی صورت میں edit کرنے کے لیے ایک ہمہ وقت ایڈیٹر درکار تھا۔ مسعود حاضر ہو گیا۔ اُس سے پہلے ہمارے پاس عمران موجود تھا۔ عمران وکالت کا امتحان دینا چاہ رہا تھا۔ اُسے کسی پارٹ ٹائم نوکری کی ضرورت تھی۔ وہی آ کر یہ کام کیا کرتا۔ لیکن جونہی عمران کورٹ میں کیس لڑنے کے قابل ہوا یہ جگہ خالی ہو گئی۔

ہمارے گھر کے علاوہ وہ سنگ میل پبلشرز کے پاس بطور ایڈیٹر کام کرنے لگا۔ چودھری افضال احمد اُسے میری اور خاں صاحب کی کتابوں کے علاوہ پروفیسر احمد رفیق اختر کی کتابیں بھی پڑھنے کے لیے دیتے ہیں جس پر وہ بہت خوش اور مطمئن ہے۔

اب مسعود کا راستہ متعین ہو گیا..... داستان سرائے، سنگ میل اور ادب سے گہری شیفتگی!

☆☆☆

اشفاق احمد کی یاد میں

مسعود میاں

مجھے ساتھ والے گھر سے کسی لڑکی کی اونچی اونچی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہمارے ساتھ والا گھر ایک ساجد کا تھا۔ اُس کا نام تو ثمر تھا لیکن اُس کی بیوی کو ساری زندگی کوئی ثمر نہیں لگا۔ جب اُن کے ہاں کوئی بچہ ہی نہیں تھا تو پھر کسی لڑکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دن کے وقت البتہ ایک لڑکی اکثر اُن کے ہاں آیا جایا کرتی تھی۔ وہ شاید اُن کی کوئی رشتہ دار تھی۔ اُس کے بال بوب کٹنگ میں تھے اور سامنے والے دانتوں میں خلا تھا۔ وہ اُس خلا پر مسلسل اپنی زبان پھیرتی رہتی تھی۔ دیکھنے والے کی نگاہ اُس کے دانتوں کے خلا میں اس طرح پھنس کے رہ جاتی تھی جیسے امرود کھاتے ہوئے آپ کے دانتوں میں اس کا کوئی بیج پھنس جاتا ہے۔ پھر اسے بڑی جدوجہد سے نکالنا پڑتا ہے۔ اکثر کوئی پھانس نہیں بھی نکلتی اور بڑے دنوں تک تکلیف دیتی رہتی ہے۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ 1978ء کی ایک تاریک رات تھی۔ میں اپنے گھر اور پڑوس کی سانجھی دیوار

کے ساتھ کھڑا تھا اور مجھے لڑکی کے مکالموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی ۔ لیکن یہ اُس بوب کٹنگ والی لڑکی کی آ نہیں تھی ۔ جب میں نے دیوار کے اُوپر سے دوسری جانب دیکھا تو وہاں گھر کے پچھلے برآمدے میں ایک تپائی پر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پڑا تھا اور اس میں اشفاق صاحب کے ڈرامے کا سین چل رہا تھا جس میں روحی بانو باغ میں کو اُڑاتی پھر رہی تھی اور پھر وہیں باغ میں لگے جھاکے سے مکالمے بولنے لگتی تھی ۔

میری عمر اُس وقت آٹھ یا نو برس کی تھی ۔ یہ میرا خاں صاحب کی کسی ڈرامائی تحریر سے پہلا تعارف تھا۔

یہ 1992ء کی بات ہے ۔ میرے پاس ایک جاپانی ٹیپ ریکارڈر ہوا کرتا تھا ۔ ابھی جاپانی میڈ چیزوں بہتات نہیں ہوئی تھی اس لیے جاپانی چیزیں عام دیکھنے کو مل جاتی تھیں ۔ اُس ریکارڈر میں پلے کے بٹن کے ساتھ سرخ رنگ کا بٹن بھی تھا ۔ جب دونوں بٹنوں کو بیک وقت دباتے تو ریکارڈنگ شروع ہو جاتی تھی ۔

ہر ہفتے کی رات آٹھ بجے میں اس ریکارڈر کو لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا اور اپنے پسندیدہ ڈ ریکارڈنگ کرتا ۔ جب ڈرامہ ختم ہو جاتا تو پھر کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور اُس ڈرامے کے ریکارڈ شدہ مکالمات کو ک میں اُن مکالمات کو لکھ کر یاد نہیں کرتا تھا یا پھر اداکاروں کی طرح اُن کو بولنے کی پریکٹس بھی نہیں کرتا تھا اس لیے اداکاری کا کوئی شوق ہی نہیں تھا ۔ اس زمانے میں میرا لکھاری بننے کا بھی کوئی خیال نہیں تھا ۔

پھر میں وہ مکالمات آخر کیوں لکھا کرتا تھا ۔ یہ وہ اہم سوال تھا جس کا جواب میرے لیے ابھی مستقبل پردوں میں چھپا ہوا تھا ۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ وہ ڈرامہ اشفاق صاحب کا تحریر کردہ تھا اور اُس کا نام تھا ” سودا ۔“

1997ء کو جب میں کراچی کینٹ سٹیشن پر اترا تو ایک بک سٹال پر کر میں نے اخبار میں پڑ نصرت فتح علی خان کا انتقال ہو گیا ہے ۔ جب ہم کسی سفر کے دوران دائم آباد کو جانے والے کسی مسافر کی خبر کتنا عجیب لگتا ہے ۔ اچانک دل میں ایک حسرت جاگتی ہے کہ جانے والا ہمارے ساتھ کچھ دیر اور ٹھہرتا تو کتنا ا جانے والا تو جا چکا ہوتا ہے اور ہمارے دل میں بس ایک کسک سی چھوڑ جاتا ہے ۔

جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو شام کے سائے گہرے ہو کر تاریک رات میں بدل چکے تھے اور سا کمرے سے نصرت فتح علی کی آواز آ رہی تھی ”سُن چرخے دی مٹھی مٹھی گھوک ماہیا مینوں یاد آوندا ۔“

میرا یہ کمرہ ڈرگ روڈ سٹیشن پر بسم اللہ ہوٹل کی اُوپر والی منزل پر تھا ۔ ہمارے کمرے میں میرے سلطان کا ٹی وی کسی خرابی کے باعث بند پڑا رہتا تھا ۔ سلطان اور آس پاس کے کمروں کے لوگ رات گئے تک رہتے ۔ میں جب اُن کے ساتھ رہائش پذیر ہوا تو تاش کے کھیل سے بالکل نابلد تھا ۔

ایک روز چھٹی والے دن سلطان اپنے خراب ٹی وی کو کھول کر بیٹھ گیا ۔ اس نے دیکھا کہ ٹی وی میں فالٹ ہے جسے وہ خود ہی ٹھیک کر سکتا ہے ۔ وہ کہیں سے ایک کاویہ بھی لے آیا اور چھوٹے چھوٹے دو تین لگانے کے بعد جب ٹی وی آن کیا تو وہ چل پڑا ۔

رات ٹھیک ساڑھے دس بجے جب سب لوگ ساتھ والے کمرے میں تاش کی بازی میں مگن تھے میں